محمد گریوال

مولانا محمد علی جوہر مرحوم

مولانا محمد علی جوہر مسلمانانِ برصغیر کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ وہ ایک اعلیٰ ادیب و شاعر، بے مثال نقاد، شعلہ بیان
ر اور صاحبِ بصیرت عالم تھے۔ مولانا کی سیرت کے ان سب پہلوؤں پر اسلام کا رنگ غالب تھا۔ وہ حقیقی
نون میں مردِ مجاہد اور مردِ مومن تھے۔ انھیں روئے زمین کے تمام مسلمانوں سے والہانہ پیار تھا۔ ان کے پختہ
زبۂ ایمانی نے زندگی کے ہر پہلو میں انھیں نڈر اور بے باک بنا دیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں جابر سلطان کے
امنے کلمۂ حق کہنے والے تھے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر باطل اور استبدادی قوتوں سے ٹکراتے رہے۔ اپنی
ں ادا پر وہ خود نازاں تھے۔ فرماتے ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اپنے زمانۂ طالب علمی میں (علی گڑھ کالج کے قیام کے دوران) شوکت علی اور محمد علی دونوں بھائیوں نے
انی نام پیدا کیا۔ دونوں بھائیوں کو جس شخصیت نے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا شبلی نعمانی تھے۔ مولانا شبلی بھی،
ن کی شخصیت و علمیت سے انکار ہرگز ممکن نہیں، وہ ان دنوں علی گڑھ میں عربی اور فارسی کے پروفیسر
تھے۔ دونوں بھائی آپ کے عالمانہ مذہبی لکچروں سے بہت متاثر تھے۔

مولانا محمد علی نے ۱۸۹۶ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اس
وقت علی گڑھ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ ۱۸۹۸ء میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف
لے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں آپ چار سال تک مقیم رہے۔ آپ کے بڑے بھائی
شوکت علی کی خواہش تھی کہ آپ انگلستان میں انڈین سول سروس کا امتحان دیں اور سرکاری افسر بنیں لیکن وہ اس
میں ناکام رہے۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا آپ آکسفورڈ یونیورسٹی سے "ماڈرن ہسٹری" میں آنرز
کی ڈگری لے کر ۱۹۰۲ء میں وطن واپس آگئے۔ نوکری کی تلاش ہوئی، علی گڑھ کالج میں لیکچرشپ کے لیے درخواست
دی۔ نواب محسن الملک (۱۸۳۷ - ۱۹۰۷ء) کالج کے سیکرٹری تھے، وہ آپ کو سٹاف میں شامل کرنا چاہتے تھے۔
انھوں نے آپ کی پُرزور سفارش کی لیکن کالج کے انگریز پرنسپل تھیوڈر مارسن نے آپ کو سٹاف میں شامل

کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ محمد علی کی ذہانت اور بے باکی سے خوفزدہ تھے۔ بہرکیف نواب رامپور نے آپ کو ملازمت میں لے لیا۔ رامپور میں آپ زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے اور جلد ہی بڑودہ چلے گئے اور تقریباً ۱۹۱۱ء تک مہاراجہ بڑودہ کی ملازمت میں رہے۔ اس دوران میں آپ نے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر کام کیا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ لیکن یہ ملازمت آپ کو زیادہ راس نہ آئی اور جلد ہی آپ نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔

انشاء پردازی کے آپ پہلے ہی سے بہت شوقین تھے۔ دورانِ ملازمت اس وقت کے مشہور و معروف انگریزی اخباروں اور رسالوں میں اپنے مضامین چھپواتے رہے۔ سب سے پہلا مضمون علی گڑھ کالج کے متعلق پنجاب آبزرور میں چھپا تھا۔ بعد ازاں "ٹائمز آف انڈیا"، "انڈین سپکٹیٹر" اور "ہندوستانی ریویو" میں آپ کے بے شمار مضامین چھپے، جن سے صحافی حلقوں میں آپ کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے، جن سے پوٹی کے انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر مضامین لکھنے کی درخواست کرتے تھے۔ واقعتاً آپ بہترین انگریزی لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں رسالوں میں چھپنے والے مضامین کی شہرت نے آپ میں اور زیادہ خود اعتمادی پیدا کر دی۔ چنانچہ انھوں نے یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو ہفتہ وار کامریڈ کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ اور اس طرح آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ آپ کی زندگی کا نہایت اہم موڑ تھا کیونکہ یہیں سے آپ کی بھرپور سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز عملی طور پر تو دورانِ ملازمت ہی ہو چکا تھا۔ آپ دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے وقت برصغیر کے عظیم رہنماؤں کے ساتھ ڈھاکہ میں موجود تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اسلامیانِ برصغیر کی سیاسی زندگی میں انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب محسن الملک اور وقار الملک نے جو مسلمانوں کی تمام تر سیاست کے کرتا دھرتا تھے، مولانا محمد علی سے اس تاریخی واقعہ کے حالات قلمبند کرنے کے لیے کہا، جو انھوں نے ان بزرگ سیاست دانوں کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے "گرین بک" سبز کتاب کی شکل میں پیش کیے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں اس نے سب سے بڑے مطالبہ علیحدہ طریقِ انتخاب کو تسلیم کر لیا۔ لیکن مسلمان اس کے باوجود مطمئن نہ تھے اور ۱۹۱۱ء کے بعد جب کہ مولانا محمد علی سیاست اور صحافت میں پوری قوت کے ساتھ کود پڑے برصغیر کے مسلمان انگریزوں سے اور بھی متنفر ہو گئے

اس سلسلے میں حالات و واقعات کی تفصیل یہ ہے:

۱۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا گیا، یہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ جن کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی تھی، اسی صدمے سے کوچ کر گئے۔ بنگال کو انگریزوں نے انتظامی وجوہات کے بہانے سے تقسیم کیا تھا۔ مشرقی بنگال کے مسلمانوں سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی لیکن وہاں صنعتی طور پر مسلمانوں کو فائدہ پہنچا تھا۔ ہندوؤں کو یہ چیز ناگوار گزری، ان کی تجارت، نوکریاں وکالتیں اور زمینداریاں خطرے میں پڑ گئیں۔ وہ صدیوں سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا استحصال کر رہے تھے۔ اب وہ تقسیم کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے زبردست مخالفت کا مظاہرہ کیا۔ دہشت پھیلائی۔ وائسرائے پر بم برسائے۔ تقریباً چھ سال تک ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخر حکومتِ وقت نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنے "طے شدہ" فیصلے یعنی تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کے جذبات کی پروا نہ کی۔ ۱۲-۱۹۱۳ء میں بلقانی جنگیں شروع ہو گئیں۔ انگریزوں نے ترکوں کی عیسائی رعایا کا ساتھ دیا اور ترکوں پر مظالم ڈھائے، جن سے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات مزید برانگیختہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی دوران یعنی جولائی ۱۹۱۳ء میں کان پور مچھلی بازار مسجد کا واقعہ پیش آیا۔ مسجد کے ایک حصہ کو حکومت کی مرضی سے مسمار کر دیا گیا۔ مسلمان اس زیادتی کی تاب نہ لا سکے۔ ان میں جوش پیدا ہو گیا۔ اسی اثنا میں مسلمانوں نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے حیلوں بہانوں سے اسے بھی رد کر دیا۔ مسلمانوں کے غم و غصے میں یہ واقعہ بھی مزید شدت کا باعث بنا۔

یہ تھے وہ واقعات و حالات، جب کہ محمد علی، جو اب مولانا بن چکے تھے، میدانِ سیاست اور صحافت میں کود پڑے۔ حالات نازک تھے برطانوی حکومت بہت مضبوط تھی۔ اس کا رعب اور دبدبہ بہت زیادہ تھا۔ ایسی حکومت کے خلاف کچھ کہنا لکھنا آسان نہیں تھا لیکن مولانا جوہر نے ایک مردِ مومن کی حیثیت سے اپنے صحافتی اور سیاسی فرائض کو نہایت ہی بہادری، بے باکی اور ثابت قدمی سے نبھایا۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کمالِ جرأت سے حکومتِ وقت کی غلط پالیسیوں کو نشانۂ تنقید بنایا۔ حکومت کو بُرے نتائج سے خبردار اور متنبہ کیا۔ باطل قوتوں سے ٹکرائے۔ جابر حکمرانوں کو چیلنج کیا۔ استبدادی حکومت کے ایوان لرز اُٹھے۔ جوہر کا قلم تنسیخ تقسیم بنگال پر اٹھا۔ بلقانی جنگوں پر اٹھا۔ طرابلس میں ترکوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر اُٹھا۔ غرض جس واقعہ پر بھی مولانا نے لکھا مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ اسی دور میں

مسلمانوں میں سیاسی شعور تیز ہونا شروع ہوا، اگرچہ انہی مسائل پر مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی لکھتے تھے لیکن جو بات مولانا جوہر کے کامریڈ میں تھی وہ زمیندار اور الہلال میں نہ تھی۔ البتہ مولانا کا اردو اخبار ہمدرد جو انھوں نے ۱۹۱۲ میں دہلی آکر نکالا تھا، زمیندار اور الہلال کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کامریڈ کی تحریروں کے تو انگریز بھی مداح تھے۔

یہ پُرآشوب دور تھا۔ مولانا نے عظیم کارنامے انجام دیئے۔ مسلمانوں میں سیاسی شعور کو تیز کیا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی دستور میں تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ ترکوں کی وکالت کے لیے وزیر حسن کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے اور وہیں پر محمد علی جناح کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ممبر بننے پر راضی کیا۔ مولانا کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اور ہندوستان واپس آکر ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرنے لگے اور جناح تو اس سلسلے میں ہندو مسلم اتحاد کے پیغمبر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ترکوں پر بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لندن ٹائمز نے اس سلسلے میں ایک اداریہ لکھ مارا۔ عنوان "چوائس آف دی ٹرکس" تھا۔ اس عنوان سے مولانا جوہر نے ترکوں کی وکالت کرتے ہوئے کامریڈ میں اداریہ لکھ دیا۔ یہ اداریہ بیس کالموں پر مشتمل تھا اور چالیس گھنٹوں میں لکھا گیا تھا۔ دوستوں نے مولانا کو سمجھایا کہ ایسا سخت اداریہ نہ لکھیں لیکن مولانا نے دوستوں سے کہا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنی دوت وارنٹ پر دستخط کر رہے ہیں یہ اداریہ ضرور لکھیں گے اور اداریہ لکھا گیا۔ حکومت سٹپٹا اٹھی اور اس تاریخی اداریہ کی بنا پر مولانا جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو ۱۹۱۵ء میں قید کر دیا گیا۔ وہ چار سال تک قید میں رہے۔

جنگ جاری رہی۔ سیاسی افق پر اور واقعات رونما ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میثاق لکھا گیا۔ اسی سال جزیرۃ العرب میں شریف حسین آف مکہ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ترک شکست کھا گئے۔ ہندوستان میں نئی اصلاحات کے لیے کوششیں ہوئیں۔ جلیانوالہ باغ جیسے واقعات رونما ہوئے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب کہ علی برادران جیلوں میں تھے۔

علی برادران کی غیر موجودگی میں بی اماں نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے شیر بیٹوں کی عدم موجودگی میں ان کے مشن کو آگے بڑھاتی رہیں اور ولولہ انگیز تقریریں کرتی رہیں۔ ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوئیں۔ اپنی جرأت مندانہ تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا۔

علی برادران کو دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا کر دیا گیا۔ حالات بدستور پُرآشوب تھے۔ تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ترکی کی شکست کے بعد سامراجی طاقتیں اس کے حصے بخرے کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ علی برادران

قید سے رہائی پاکر سیدھے امرتسر پہنچے جہاں سیاسی پارٹیوں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ اب انھوں نے تحریکِ خلافت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گئے۔ ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ اس طرح ہر طرف تحریکِ خلافت کا ڈنکا بجنے لگا۔ علی برادران کی رہائی کے تیس دن بعد ۳۰ ہزار افراد جیلوں میں جا چکے تھے۔ مولانا جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان گیا لیکن انگریز شاطروں نے فتح کے نشے میں اس وفد کے مطالبات پر توجہ نہ دی اور وفد ناکام واپس آگیا۔ بہرحال تحریک پورے زوروں پر تھی۔ مہاتما گاندھی نے بھی چابک دستی سے عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی نے ظاہری طور پر تحریکِ خلافت کی حمایت کی تھی۔ اس لیے علی برادران نے عدم تعاون کی تحریک میں بھرپور حصّہ لیا۔ گاندھی مسلمانوں کی تحریکِ خلافت سے جھنجھلا اٹھے تھے۔ کیونکہ اس طرح مسلمان ہندوستان کی سیاست پر چھا رہے تھے۔ اور گاندھی جیسے چالاک ہندو رہنما اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے عدمِ تعاون کی تحریک چلائی تھی۔ اور جب یہ دیکھا کہ مسلمان اس کے ذریعے بھی سیاست پر حاوی ہو رہے ہیں تو فوراً یہ تحریک بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ کہنا مناسب نہیں کہ مولانا جوہر گاندھی کے سیاسی چکر میں آگئے تھے۔ مولانا صاف دل انسان تھے۔ انھیں تو انگریزوں کا مقابلہ کرنا تھا اس لیے ہندوؤں کی حمایت کے متقاضی ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔

اسی سلسلے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہاں تک کہہ گزرے کہ شملہ وفد کی تشکیل کمانڈ پرفارمینس (COMMAND PERFORMAICE) تھی۔ یہاں اس امر کی نشاندہی کر دینا ضروری ہے کہ مولانا نے اس قسم کے الفاظ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کاکناڑا میں کہے تھے۔ ان کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا جو ہندو مورخین بیان کرتے ہیں اور دلیل کے طور پر اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ہندو مؤرخین کے دعوے کو پروفیسر ڈاکٹر سید رضی واسطی نے مولانا کا ایک خط، جو انھوں نے اس وقت کے وائسرائے کو لکھا تھا، سکاٹ لینڈ کی نیشنل لائبریری سے دریافت کر کے بالکل قرار دے دیا ہے۔ مولانا نے اپنے خط میں مسلمانوں کے مطالبات پر، جو "شملہ وفد" میں پیش کیے گئے تھے، وائسرائے کی طرف سے خاص توجہ نہ دینے کی شکایت کی ہے۔ اگر وہ "شملہ وفد" کو بقول ہندو مورخین کمانڈ پرفارمینس" سمجھتے تھے تو وہ ایسے خیالات کا اظہار اس وقت بھی کر سکتے تھے۔

علی برادران کی شہرت تحریکِ خلافت کی وجہ سے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں کراچی خلافت کانفرنس کے دوران ایک زبردست تقریر کی، جس میں مسلمان فوجیوں کو برطانوی ملازمت چھوڑ دینے کا

مشورہ دیا۔ حکومت نے اس کی پاداش میں علی برادران کے خلاف مقدمۂ بغاوت درج کرلیا۔ اور وہ جلد ہی قید کر دیئے گئے۔ اس مقدمۂ بغاوت کی ساری کاروائی کراچی میں ہوئی۔ حکومت نے مختلف ذریعوں سے علی برادران کو آئندہ محتاط رہنے کی درخواست کی۔ لیکن علی برادران اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اور ان کے عزم و استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ ان کی عدم موجودگی میں بی اماں نے پہلے سے زیادہ زبردست جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ملک کے طوفانی دورے کیے، دھواں دھار تقریریں کیں۔ ہر طرف یہی بات لوگوں کی زبان پر تھی :

بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ایسی عظیم ماں کے ہوتے ہوئے شیر بیٹوں کے پاؤں میں لغزش کیسے آسکتی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں علی برادران کو رہا کر دیا گیا۔ اب تحریکِ خلافت کا زور ٹوٹنا شروع ہوگیا تھا۔ ترکی میں سیاسی انقلاب آچکا تھا۔ مصطفےٰ کمال برسرِ اقتدار آچکے تھے۔ سلطان کے ادارے کو ختم کر دیا گیا تھا۔ تاہم خلافت کے ادارے کو برائے نام قائم رکھا گیا لیکن ۱۹۲۴ء کے شروع میں خلافت بھی ختم کر دی گئی۔ خلافت کے خاتمہ سے تحریکِ خلافت کمزور ہوگئی۔ علی برادران نے اپنے مشن کو جاری رکھا لیکن پہلے کی سی بات نہ رہی۔ اب فرق یہ تھا کہ وہ پہلے کی طرح اب ہندو رہنماؤں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ اب وہ ذہنی طور پر مسلم لیگ کی طرف مائل ہو رہے تھے اور روز بروز کانگرسی لیڈروں سے دُور اور مسلم لیگ قیادت کے نزدیک ہوتے گئے۔ ۱۹۲۷ء کی "تجاویزِ دہلی" کی تدوین میں محمد علی جناح کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد بغرض علاج انگلستان تشریف کے لیے گئے لیکن دوران علاج نہرو رپورٹ کی اشاعت کی خبر پہنچی فوراً عازمِ وطن ہوئے۔

نہرو رپورٹ موتی لال نہرو کی قیادت میں مرتب کی گئی تھی۔ اگرچہ انگریزوں کے چیلنج کے جواب میں اہالیانِ ہندوستان کی مشترکہ آئینی دستاویز کے طور پر ترتیب دی گئی تھی۔ لیکن اس میں اس دَور کے مسلمانوں کے مشہور مطالبات کو رَد کر دیا گیا تھا۔ وفاقی طرزِ حکومت، کونسلوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کا ایک تہائی حصہ، مسلم ثقافت کی حفاظت، اردو کی ترقی، صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں نئی اصلاحات، مسلمانوں کے اس دَور میں مشہور مطالبات تھے۔ جن کو "تجاویزِ دہلی" کے ذریعہ یک جا کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان سب مطالبات کو کانگرسی شاطروں نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ دراصل ہندو ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن مسلمانوں کے مخلص رہنما اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ نہرو رپورٹ

کو دسمبر ۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کنونشن میں تبصرہ کے لیے پیش کیا گیا۔ مسلمان نمائندے بھی شامل ہوئے۔ محمد علی جناح نے ترامیم پیش کیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے ان ترامیم کی پُرزور حمایت کی۔ کنونشن کے چوتھے اور پانچویں دن جب قائدِ اعظم محمد علی جناح اور جوہر نے تقریریں کیں تو اُن پر ہندو رہنماؤں نے آوازے کسے۔ قائدِ اعظم کو کانگرس کا بگڑا ہوا بچہ گردانا گیا اور جوہر کو گالیاں دی گئیں۔

محمد علی جوہر ان حالات سے نا اُمید نہ ہوئے اور برابر اپنے مشن کے لیے کام کرتے رہے۔ اب وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں تھے۔ یہ بھی یاد رہے کہ آپ دو قومی نظریہ کے پُرزور حامی بن گئے تھے اور اسی لیے ہندو رہنماؤں پر زور دیتے تھے کہ وہ مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر لیں۔ اور پھر آگے قدم بڑھائیں۔ لیکن ہندو رہنماؤں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے گھناؤنے عزائم کا اظہار کرتے رہے۔

مولانا کی زندگی کا آخری بڑا واقعہ ان کی گول میز کانفرنس (۳۰-۱۹۳۱ء) میں شمولیت ہے۔ مولانا سخت بیمار تھے، ذیابیطس کے علاوہ اور بھی کئی بیماریاں تھیں لیکن اس کے باوجود گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ اس لیے کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کی قسمت کے متعلق فیصلے ہونے والے تھے۔ مولانا نے بیماری کے باوجود کانفرنس کی کاروائیوں میں بھرپور حصّہ لیا اور کہا: "جب تک مجھے پروانۂ آزادی نہیں مل جاتا میں وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جا سکتا۔ میں ایک غیر لیکن آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر تم ہمیں ہندوستان میں آزادی نہیں دے سکتے تو پھر تمھیں اپنے ملک میں میری قبر کے لیے جگہ مہیا کرنا ہوگی۔"

اس تاریخی تقریر کے تھوڑے عرصے بعد ہی یعنی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو آپ اس جہان سے کوچ کر گئے۔ غیر لیکن آزاد ملک میں وفات پانے پر آپ کی روح مطمئن ہوگی۔ دنیائے فرنگ تو آپ کو آپ کی خواہش کے مطابق پروانۂ آزادی نہ دے سکی۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو پورا کر دیا کہ غیر لیکن آزاد ملک میں موت دے دی اور قبر کے لیے بیت المقدس جیسی پاک سرزمین میں جگہ عطا فرمائی۔ مولانا کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو اس دنیا میں ان کی اسلامی خدمات کے پیشِ نظر انھیں مل سکتا تھا۔